خلیج کا آئندہ بحران☆

گیری سک

بیسویں صدی کے نصف آخر، بالخصوص ۱۹۷۱ء میں برطانوی انخلا کے بعد خلیج فارس کا علاقہ مسلسل مختلف دھچکوں کی زد میں رہا۔ تیل کے دو بڑے بحران جنھوں نے عالمی اقتصادیات کو متاثر کیا، دو مقامی جنگیں جنھوں نے علاقے کی مالیات کو نچوڑ کر رکھ دیا، اور اسلامی انقلاب جس کے نتیجے میں ایک علاقائی قوت یعنی ایران کا سیاسی منظر یکسر تبدیل ہوگیا۔ ایسے میں عام توقع کے مطابق علاقے کی شکل بدل جانی چاہیے تھی لیکن کم از کم اوپر سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ انگریز کو رخصت ہوئے تیس برسوں سے زیادہ ہوئے لیکن خلیج کی ان ریاستوں میں بدستور وہی خاندان بلکہ اکثر وہی افراد حکمران ہیں۔ طرز حکمرانی بھی وہی روایتی اور سالخوردہ ہے یہاں تک کہ جغرافیائی حد بندیاں بھی وہی ہیں جو انگریز ایجنٹوں نے تجویز کی تھیں۔ قبائلی امارتیں تاحال مستحکم ہیں۔ اگرچہ دولت میں اضافہ ہوا، رسل و رسائل بہتر ہوئے، مدنیت اور صنعت کو راہ ملی لیکن مجموعی صورت حال جوں کی توں ہے۔

جب کچھ ملکوں کے متعلق بعض سیاسی حقائق کو عام طور پر پیش پا افتادہ مان لیا جائے تو کسی حد تک تردّد ضرور ہونے لگتا ہے۔ خلیج کے معاملے میں یہی ہوا کہ اس کے تسلیم شدہ استحکام کی کوکھ سے اُن سیاسی حیرتوں نے اچانک جنم لیا جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا۔ تبدیلی گویا راتوں رات آجاتی ہے۔ اپنی بعض ناکامیوں کے باوجود رضا شاہ کے ایران کے متعلق کون یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہاں انقلاب دہلیز پر کھڑا ہے۔ شاہ کے بدترین نقاد بھی اتنی تیز رو تبدیلی پر حیران تھے۔ مدتوں ایک عام خیال یہ تھا کہ کوئی عرب ملک اپنے بھائی عرب ملک پر حملہ نہیں کرے گا لیکن صدام حسین نے ۱۹۹۰ء میں کویت کو روند کر یہ خیال باطل کر دیا۔ جب تک عراقی فوجیں کویت شہر کے مضافات میں نہیں پہنچیں خود کویتی بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ محض فریب (bluff) ہے یا پھر سرحدی تنازعہ ہے اور وہیں تک محدود

☆Gary Sick, "The Coming Crisis in the Persian Gulf, *The Washington Quarterly*, Spring 1998, PP. 195-212 (تلخیص: محبّ الحق صاحبزادہ)

رہے گا۔
خلیج کی بات کرتے ہوئے تجزیہ نگاروں کی توجہ ممالک کے آپس کے تعلقات اور جھگڑوں پر رہتی ہے، اور حالیہ تاریخ کی روشنی میں اس کا جواز بھی ہے، لیکن مستقبل کی صورت گری کرنے والے اہم مقامی اور معاشی عوامل نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ یہ ریاستیں اگر اندرونی تضادات پر قابو پالیں تبھی اندرونی و بیرونی چیلنجوں کا اور جارحیت کا مقابلہ ہو سکے گا۔ اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ خلیج کا اگلا اور سنگین بحران دبے پاؤں بڑھ رہا ہے۔ بس کچھ وقت کی بات ہے کہ یہ بحران اندر اور باہر کی ساری سیاست کی نئی صورت گری کر دے گا۔

جن سماجی، معاشی اور حقوق و فرائض سے متعلق مسائل کا خلیجی ریاستوں کو سامنا ہے اُن کا علاج عام سطح پر بھی معلوم ہے لیکن مقتدر حلقوں کے لیے یقیناً ناپسندیدہ ہے تبھی تکلیف دہ اور جسورانہ فیصلے نہیں ہو پا رہے۔ پورے علاقے کے لیے کوئی ایک لگا بندھا حل تجویز بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یکسانیت کے باوجود ہر ملک کے مخصوص مسائل ہیں اور انہیں حل کرنے کی جو بھی اچھی بری کوششیں ہو رہی ہیں مختلف مراحل میں ہیں۔ یہ مسائل چونکہ عرصہ دراز سے موجود ہیں اس لیے ایک سوچ یہ بھی ہے کہ اگر کچھ دن، ہفتے یا سال مزید ایسے ہی گزر جائیں تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ یعنی بحران کو بحران نہیں مانا جا رہا۔

تلخ فیصلے لازماً فیصلے کرنے والوں کے حق میں نہیں جاتے۔ چنانچہ شاہوں، شہزادوں اور امراء کو تبدیلی سے چنداں غرض نہیں۔ بلکہ وہ سمجھتے اور باور کراتے رہتے ہیں کہ حالات کو چھیڑنے کی کوشش کی گئی تو زیادہ بڑے مسائل جنم لیں گے۔

بے حد بنیادی مسائل سے اس اغماض کے نتیجے میں غلط اور گمراہ کن احساس تحفظ پروان چڑھا ہے۔ تنبیہ کرنے والے مسلسل سمجھا رہے ہیں کہ کچھ کیا جائے لیکن ایک نظر فریب پالیسی جو دہائیوں سے کامیاب چلی آ رہی ہے اور جس کے خلاف عوامی سطح پر کوئی خاص احتجاج بھی نظر نہیں آ رہا، اسے بدلنے کا کون اور کیوں سوچے۔؟

خلیج میں موجود سیاسی، فوجی اور معاشی تبدیلی کا سب سے بڑا عامل ایک فرد واحد ہے۔ صدام حسین نے اپنا ملک ہی برباد نہیں کیا اُس نے پاس پڑوس کی آرام طلب اور راحت آشنا زندگی کے معمول کو بھی اتھل پتھل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس نے ایران پر حملہ کیا اور نتیجہ میں اپنے سمیت سب کو کنگال کر گیا۔ وہ اپنی خالی جیب بھرنے کے لیے کویت پر چڑھ دوڑا اور اُسے وہاں سے نکالنے پر ارب ہا ارب ڈالر پھونکنے پڑے۔ خلیجی ممالک کے اندرونی

حالات یقیناً اُن کے اپنے پیدا کردہ ہیں لیکن صدام نے اُن کی تیل کی کمائیاں اور بچتیں نچوڑ کر بڑے تلخ اور سنگین حقائق اُن کے سامنے لا کھڑے کیے ہیں۔

یہ معلوم حقیقت ہے کہ ملکی تحفظ کی ضرورت محض فوجی دفاعی صلاحیت سے پوری نہیں ہوتی۔ شاہ کا ایران اور کمیونسٹ روس فوجی لحاظ سے کمزور نہ تھے لیکن اس قوت کو سہارا دینے والا سیاسی، معاشی اور سماجی ہیکل اساسی موجود نہ تھا یا کمزور تھا۔ چنانچہ وقت آنے پر یہ دونوں نظام ہائے حکومت ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ حال ہی کے یہ حسرتناک تجربات دیکھ کر بھی تیسری دنیا کے بعض ممالک سمجھ نہیں پارہے کہ مددگار معیشت واقتصاد موجود نہ ہو تو فوجی قوت بھی آخر کس کے سہارے اور کتنی دیر کھڑی رہے گی۔

خلیج کی آٹھ ریاستیں جن کا کل رقبہ ۱۷ لاکھ مربع میل اور آبادی (۱۹۹۵ء میں) صرف ۱۱ کروڑ ہے، دنیا بھر کے تیل کے ۶۵ فیصد وسائل کی مالک ہیں۔ اس امر واقعی نے کچھ غلط اندازوں اور خوش گمانیوں کو جنم دیا۔ دولت بے پایاں ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک سے کوئی تقابل نہیں کیونکہ سارا انحصار تیل کی آمدنی پر ہے جو کوئی مستقل اور دیرپا ذریعہ نہیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے ابتدائی دو ایک برسوں کے بعد تیل کی قیمتوں میں کمی آئی تو بجٹ خساروں کا عام سامنا کرنا پڑا۔ حساب لگائیں تو سب خلیجی ممالک کی کل قومی آمدنی شاید سوئٹزرلینڈ کے برابر ہو جو ۷۰ لاکھ کی آبادی کا چھوٹا سا ملک ہے۔ مراکش سے افغانستان تک پھیلے ہوئے شمالی افریقہ اور شرق اوسط کے ممالک (بہ شمول اسرائیل) کی ۱۹۹۴ء کی کل قومی آمدنی فرانس کی آدھی قومی آمدنی سے بھی کم تھی۔ سوائے ایران کے کہیں بھی کوئی مستحکم اور ترقی یافتہ صنعتی ڈھانچہ موجود نہیں اور ایران میں بھی یہ ہیکل معیار مطلوب سے کافی کم درجہ میں ہے۔

جس طرح کسی نکھٹو آرام طلب کو مفت میں میراث کی دولت مل جائے اور وہ اس میں اضافے کی سوچنے کی بجائے کھانے پینے میں اڑانے لگے، بس یہی حال خلیجی ممالک میں تیل کی ''برکت'' کا ہے۔ ایسے میں بڑی بنیادی خرابیاں جنم لیتی ہیں، کہ وقت گزرنے پر کسی سرجیکل علاج کے بغیر ان کا مداوا ممکن نہیں ہوتا۔ ذیل میں چند اہم خرابیوں کی مختصراً نشان دہی کی جاتی ہے :

(۱) ان ممالک میں بجٹ کی صورت حال ہمیشہ مبہم اور غیر یقینی رہتی ہے کیونکہ کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ تیل کی قیمتوں میں کیا اتار چڑھاؤ ہوگا۔ ہر کوشش کی گئی لیکن تیل کی قیمت کو حسب خواہش منظم کرنا ممکن نہیں ہوسکا۔ ایسے حادثے اور واقعات جن پر ان ممالک کا کوئی بس

نہیں چلتا تیل کی قیمتیں اوپر نیچے کر دیتے ہیں اور ان کے بجٹ اہداف دھرے رہ جاتے ہیں۔اسی لیے احتیاطاً اہداف بہت کم رکھے جاتے ہیں جو ایک دوسری طرح کی خرابی ہے۔
(۲) اہم ذرائع پیداوار چونکہ ریاست کی ملکیت ہیں اس لیے پبلک سیکٹر کا کردار غالب رہتا ہے۔دبئی کا تجارتی کلچر ثابت کرتا ہے کہ آزاد منڈی کی معیشت نسبتاً زیادہ فائدہ مند ہے لیکن وہاں بھی معاش کے بڑے شعبے حکمران خاندان کے قبضے میں ہیں۔لوگ اپنی جگہ پبلک سیکٹر کو پسند کرتے ہیں کہ آرام و آسائش اور تنخواہیں بہتر ہوتی ہیں، ملازمت کی ضمانت حاصل رہتی ہے اور ایسی ہی کئی اور مراعات ہیں جو پرائیویٹ سیکٹر میں نہیں ملتیں۔لیکن یہی چیز انجام کار پبلک سیکٹر کی خستگی اور ٹوٹ پھوٹ کا باعث بن جاتی ہے۔
(۳) متحرک اور جاندار پرائیوٹ سیکٹر نہ ہو تو روزگار کے مواقع محدود رہتے ہیں۔ایسے میں غیر ملکی ہنر مندوں کی بھی بھر مار ہو تو حالات سنگین ہو سکتے ہیں۔درآمدی لیبر کے حوالے سے متحدہ عرب امارات کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ کل ۲۴ لاکھ آبادی میں تین چوتھائی غیر ملکی ہیں۔کام کے جو بھی مواقع پیدا ہوتے ہیں وہ تقریباً سب یہی بیرونی مزدور لے جاتے ہیں۔چنانچہ لیبر قوت میں مقامیوں کا تناسب عرب امارات میں صرف ۱۰ فیصد ہے۔یہی تناسب قطر میں ۱۷ فیصد، کویت میں ۱۸ فیصد، سعودی عرب میں ۳۱ فیصد اور بحرین میں ۴۰ فیصد ہے۔۱۹۹۵ء کے آس پاس سعودی تیل کی آمدنی کا ۴۰ فیصد بیرون ملک منتقل ہو جاتا تھا۔

تیل کی آمدنی میں جب اضافہ ہوا تو خلیجی ممالک مین سماجی خدمات کا دائرہ کافی وسیع کر دیا گیا تھا۔ایسے میں جبکہ مقامی آبادی میں معتدبہ اضافہ ہوا، تعلیم بھی ہر سطح پر عام ہوئی۔ لیکن پڑھا لکھا مقامی نوجوان پرائیوٹ سیکٹر کے ''گندے'' (blue collar) کاموں میں ہاتھ ڈالنے پر آمادہ نہیں، یا پرائیوٹ سیکٹر اُسے غیر ملکیوں کے مقابلے میں ترجیح نہیں دیتا کیونکہ مقامیوں کو قانوناً زیادہ تنخواہ اور مراعات دینی پڑتی ہیں۔مقامیوں کی یہ بے روزگاری مسائل کو جنم دے رہی ہے اور صورت حال گھمبیر ہوتی جارہی ہے۔گو حکومتیں مختلف اقدامات کر رہی ہیں مثلاً غیر ملکیوں کی آمد پر قدغن، لیکن عملاً یہ ہو رہا ہے کہ ایک مسئلہ حل ہوتا ہے تو جواب میں کئی لاینحل مسائل آکھڑے ہوتے ہیں۔ایک مخمصہ ہے جس کی شدت بڑھ رہی ہے کہ اپنے لوگوں کو کھپانا ہے لیکن افراط زر بھی نہ ہو اور ارزاں لیبر کے طلب گار مقامی طاقتور تجارتی حلقے بھی رام رہیں۔اکثر حکومتیں سمجھ نہیں رہیں کہ یہ دو متضاد کام کیسے ہوں۔

(۴) مقامی آبادی کی روز افزوں بے روزگاری نے خطرناک مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ خاندانی اور سرکاری نظام کفالت نے اس صورت حال کو کچھ سنبھالا ضرور دیا لیکن ظاہر ہے یہ مستقل حل نہیں۔ ۱۹۹۵ء میں ساڑھے چھ لاکھ سے زیادہ سعودی شہریوں کو، جو کل آبادی کا ۶ فیصد بنتے تھے، روزگار کی ضرورت تھی۔ ۱۹۹۶ء میں بے روزگاری کا اندازہ ۲۰ فیصد تک تھا۔ ایران کی حالت اس حوالے سے کافی ابتر ہے جہاں ۱۹۹۰ء میں قریباً نصف آبادی (۴۸ فیصد) ۱۸ برس یا اس سے کم عمر کی تھی اور لیبر مارکیٹ میں ہر برس مسلسل ۱۰ لاکھ افراد کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک آزاد ذریعہ کا اندازہ ہے کہ ۲۰۱۰ء تک خلیج کونسل کے ممالک کو روزگار کے ۸۰ لاکھ مواقع پیدا کرنے ہونگے ورنہ سیاسی اور سماجی انتہا پسندی کا دور دورہ ہوگا۔

(۵) معاشی آسودگی دیکھ کر خلیجی ممالک میں مقامی آبادی بڑھانے پر زور دیا جاتا رہا۔ اب آمدن محدود ہوئی تو بڑھتی ہوئی آبادی کی ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ بھلے وقتوں میں سماجی خدمات اور تحفظات کا بڑا وسیع نظام وضع کیا گیا تھا اور لوگوں کو بہت کچھ مفت ملتا تھا لیکن گزشتہ ایک دہائی کی چپقلشوں کے بعد یہ سب ممکن نہیں رہا۔ دیکھئے کہ ۱۹۸۰ء میں سعودی عرب میں سالانہ فی کس آمدنی ۱۹۰۰۰ ڈالر تھی جو ۱۹۹۶ء میں صرف ۶۹۰۰ ڈالر رہ گئی۔ یاد رہے کہ عالمی بنک کا امیر - غریب خط اتصال ۷۶۲۰ ڈالر ہے۔ گویا اس پیمانے سے اب سعودی عرب ''غریب'' ہے۔ تیل کی قیمتوں میں ڈرامائی اضافے کا امکان نہیں کہ غالب صنعتی ممالک ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ کسی حد تک آمدنی میں اضافہ ہوا بھی تو اس سے صورت حال پر زیادہ اثر نہیں پڑے گا۔

(۶) عوامی شرکت، بالخصوص ذمہ داریوں کے حوالے سے، نہ ہونے کے برابر ہے۔ لوگ مملکت کے وسائل سے فوائد تو حاصل کر رہے ہیں لیکن یہ یک طرفہ تقسیم ہے کہ ان کی طرف سے مملکت کا ہاتھ نہیں بٹایا جا رہا۔ ایران کے استثنا کے ساتھ باقی کسی جگہ بھی حکومت میں حقیقی عوامیت کا رنگ موجود نہیں۔ اختلاف رائے بغاوت کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ ایران اور کویت کے علاوہ کسی بھی جگہ بھڑکے ہوئے جذبات کے اخراج کا انتظام موجود نہیں۔ یہ صورت حال زیر زمین سرگرمیوں اور انتشار کا باعث ہوا کرتی ہے کیونکہ جبر کے تحت قائم کیا ہوا استحکام اور سکون عارضی اور نظر فریب ہوتا ہے۔

(۷) احتساب کا کوئی وجود نہیں جبکہ وسائل حکمران خاندانوں کے قبضہ میں ہیں جو انہیں جیسے چاہیں خرچ کرتے ہیں۔ جب تک پٹرو ڈالرز کی فراوانی تھی بے چینی سامنے نہیں آئی

لیکن اب حالت چنداں اطمینان بخش نہیں۔ تیل کی آمدنی کا اچھا خاصا حصہ غائب ہو جاتا ہے اور پتہ نہیں چلتا کہاں گیا۔ ہو سکتا ہے اس رقم کا کچھ حصہ ایسی دفاعی یا دیگر اہم قومی ضرورتوں میں کھپتا ہو جس کا بجٹ میں باقاعدہ حساب نہیں دکھایا جاتا، لیکن غائب ہونے والی رقم فی الواقعی بہت زیادہ ہے جس سے شک پیدا ہو رہا ہے۔ مثلاً ۹۴-۱۹۹۰ء کے دوران سعودی بر آمدات کا ۳۰ فیصد، امارات کا ۲۹ فیصد، کویت کا ۲۴ فیصد، قطر کا ۱۹ فیصد، بحرین کا ۱۸ فیصد اور اومان کا ۹ فیصد حصے کا کہیں کوئی حساب موجود نہیں۔

ایران کا کیس

اس بحث میں عراق کی بات قصداً نظر انداز کی گئی ہے کہ ایک تو اس پر عرصہ سے اقتصادی پابندیاں ہیں جن کے ہوتے حقیقی صورت حال سمجھنا ممکن نہیں۔ نیز یہ کہ وہاں ہر بات کا مدار ایک فردواحد یعنی صدر صدام حسین پر ہے جس کے فیصلے حالات کو کسی بھی رخ پر لے جا سکتے ہیں۔ البتہ بہ حیثیت ایک غیر عرب ملک ایران کا مختصر مگر خصوصی مطالعہ مفید ہو گا۔

ایران تین مختلف پانیوں (خلیج فارس، خلیج اومان، کیپین) سے ملحق، کافی بڑی آبادی (چھ کروڑ-۱۹۹۶ء) اور خلیج کے آدھے ساحل کا مالک علاقے کا وہ واحد ملک ہے جہاں حقیقی عوامی انقلاب آیا۔ یہ وہ ملک ہے کہ دنیا بھر سے نرالے دستوری - عوامی - مذہبی نظام کا تجربہ کر رہا ہے۔ گو ایران کا بیشتر انحصار بھی تیل کی آمدنی پر ہے لیکن یہاں مختلف النوع چھوٹی بڑی صنعتیں بھی موجود ہیں۔ قالین بافی اور زرعی اشیاء کی پیداوار سے آگے بڑھ کر یہاں سٹیل، کار سازی، جہاز سازی اور چھوٹے طیاروں تک کی صنعتیں قائم ہیں۔ دوائیں، پلاسٹک اور بہت سی دوسری بنیادی اشیائے صرف بھی پیدا ہوتی ہیں۔ باقی خلیجی ممالک کے بر خلاف ایران اپنے محاصل کا ۲۰ فیصد ٹیکس ذریعہ (بہ شمول انکم ٹیکس) سے حاصل کرتا ہے۔

ایران کی ایک خلش یہ رہی ہے کہ یہ خالص اسلامی ریاست بنے یا بڑی حد تک ایرانی رہے۔ شاید حالات کا جبر تھا کہ اجتہاد کے سہارے آزاد روی کی راہ اپنانے اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ رہنے کی دانستہ کوشش ہوئی، چنانچہ بیشتر معاملات میں ''قومی تقاضوں'' کو اہمیت ملی۔ لیکن اس کی قیمت قدامت پسندوں اور جدت پسندوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی چپقلش کی صورت میں ادا کی جا رہی ہے۔

انقلاب، عراق سے آٹھ سالہ جنگ، تیل کی قیمتوں میں کمی اور ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بے تحاشہ قرضوں کے حصول نے ایران کی اقتصادیات کو مشکل سے دوچار کیا ہوا ہے۔ قرض کا حصول خاص طور پر بھاری غلطی ثابت ہوا کہ ۱۹۹۶ء تک یہ بوجھ ۲۳ بلین ڈالر ہو گیا اور سالانہ ادائیگیوں میں تیل کی آمدن کا ایک چوتھائی کھینچنے لگا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایران نے مالی امور میں کفایت کی، درآمدات کا متبادل خود پیدا کرنے پر زور دیا اور باقی خلیجی ممالک کے برعکس برتھ کنٹرول (تحدید آبادی) کا زوردار پروگرام چلایا۔ ساتھ ساتھ اس نے وسطی ایشیا، مشرق بعید، جنوبی ایشیا اور مشرقی افریقہ سے فائدہ مند تجارتی اور معاشی روابط استوار کئے۔

لیکن ایران کی کامیابی کا اصل مدار اس پر ہو گا کہ وہ اپنے ہاں سیاسی اداروں اور ملکی پالیسیوں کے تضادات پر کیسے قابو پاتا ہے۔ افراد کی طرف ہر معاملہ میں رجوع اور اُنہی پر کامل تکیہ اور مقابلے میں اداروں سے صرف نظر خرابیوں کی اصل جڑ ہے جس کا علاج ضروری ہو گا۔

خلیجی ممالک کے مسائل کا حل

۱۹۹۰ء کی دہائی میں بیان شدہ مشکلات کا ادراک کرتے ہوئے خلیجی ممالک نے کئی اطراف میں اقدامات کئے۔ سب سے اہم یہ کہ فوجی سازوسامان کی خریداری میں کافی کمی کی گئی۔ دیگر حکومتی اخراجات میں کٹوتی، بے سود پروگراموں کا خاتمہ، بیرونی امداد (دینے) میں کمی، ادائیگی قرض میں پھیلاؤ اور بعض اوقات بندش، سرکاری خدمات کی قیمتوں میں کچھ اضافہ اور محتاط اور محفوظ قسم کی مشاورتی کونسلوں کے ذریعے امور مملکت میں عوامی شرکت کا تاثر، چند دیگر اہم اقدامات ہیں۔ خلیج کے ہر ملک کے اپنے مخصوص حالات ہیں جس کی وجہ سے پورے علاقے کے لیے کوئی ایک لگا بندھا حل بتانا مشکل ہے۔ پھر علاج تجویز بھی کر دیا جائے تو اس پر عمل چنداں آسان نہیں کہ فیصلہ کرنے والوں نے اپنا مفاد بھی پیش نظر رکھنا ہوتا ہے۔ تاہم مختلف تجزیہ نگاروں اور اداروں نے کم و بیش ایک ہی سا حل تجویز کیا اور اُسی کی جھلک مذکورہ اقدامات میں بھی ملتی ہے۔

عالمی بنک کے خیال میں مسئلہ تیل کی قیمتوں میں کمی، مقامی کارکنوں کی عدم تربیت، معاش و اقتصاد میں آزاد روی یا تجارتی کا فقدان، بھاری بھر کم بیوروکریسی یا سرکاری انتظامیہ، اور سرکاری شعبہ میں وسائل کے ضیاع سے عبارت ہے۔ بنک کا تجویز کردہ نسخہ

بھی مرض کی تشخیص کے مطابق اور پورے شرق اوسط کے لیے یکساں ہے۔

دوسرے اہم ادارے یعنی عالمی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) نے نسبتاً بہتر صورت حال والے متحدہ عرب امارات کو سامنے رکھ کر خطاب کیا ہے۔ ''فنڈ'' کے نزدیک علاج یہ ہے کہ سخت تر مالی اصلاحات اور زر تلافی میں کمی ہو، سول سروس میں موجود بے کار افرادی قوت کی چھانٹی ہو، غیر پیداواری اخراجات کی تحدید کی جائے اور صرفی ٹیکسوں کا نظام متعارف کیا جائے۔ آئی ایم ایف کے مطابق یہی نسخہ باقی خلیجی ریاستوں کے لیے بھی شافی ہوگا۔ تمام تجاویز حل یکجا کر کے دیکھے جائیں تو موٹے موٹے خدوخال یہ سامنے آتے ہیں

- فعال نجی شعبہ،
- سرکاری اداروں کی نج کاری،
- مراعات اور تلافی کی واپسی،
- ٹیکس سسٹم کا رواج،
- بہتر اور حسب حال تعلیم و تربیت،
- سیاسی اصلاحات: شرکت عمومی کا انصرام،
- حکمران طبقہ کے لیے احتسابی نظام اور اُن کے اختیارات کی حد بندی۔

ان میں سے بعض اقدامات یقیناً تکلیف دہ ہیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی نسخہ اتنا کڑوا نہیں جتنا تیسری دنیا کے دیگر ممالک کو نگلنا پڑ رہا ہے۔ تبدیلی تو ہر قیمت لانی پڑے گی۔ ہاں یہ ہے کہ چونکہ بحران شدید نہیں آہستہ رو ہے، اس لئے یہ ممکن ہے کہ تبدیلی بتدریج لائی جائے۔ ورنہ لاوہ پک رہا ہے اور جلد یابدیر ضرور پھٹ پڑے گا۔